

ساتھ شباب بھائی کے پاس بیٹھیں لیکن چونکہ میں اس کی طرح ضعف الاعتقاد نہیں ہوں اس لئے میں نے اس کی یہ غواہش کبھی بھی پوری نہ کی۔

لندن سے واپسی پر شباب کے پاؤں کے انگوٹھوں کے ناخن کناروں پر اندر کو دھنس گئے تھے اور اس In-growth سے اس کو بڑی تکلیف رہتی تھی۔ ولایت کے Pedicurist پانچ پاؤں لے کر اس کے انگوٹھوں کے ناخن کاٹ کر اور ان کے کوئی اور انداز کر نیچے بھی ہوئی روپی کی پھریاں رکھ دیتے تھے۔ کوئی میدینہ بھر تو اس سے آرام رہتا تھا لیکن ناخنوں کے پھر بڑھ جانے سے پھر وہی تکلیف شروع ہو جاتی تھی۔ لاہور میں ہم نے باتا کی مال روڈ والی دکان سے رابطہ قائم کیا تو پہلے چلا کہ یہاں ایک ”پیڈی کیورسٹ“ ہے جو ناخن بھی کاٹ دیتا ہے، ان کی چونچیں گھسا کر گول بھی کر دیتا ہے۔ پاؤں کی چنڈیاں، ٹھیکھیں اور کارن بھی کاٹ دیتا ہے لیکن اس سے پہنچنی اپنائیں لینا پڑتی ہے۔ یہ کام میرے پر دھوا۔ ہر میں نے، سوامی نے بعد میں اپنائیں لیتا اور پھر شباب صاحب کو اطلاع دے کر لاہور بالیتا۔ آپریشن کروانے کے لئے ہر ہمار مجھے ان کے ساتھ جانا پڑتا اور میں پیڈی کیورسٹ کی مہارت کو دیکھ کر دل ہی دل میں اس کی داد دیا کرتا۔ اس کے پاس بست سے ولائی اوزار، پھریاں، ریگ مال، ریتیاں اور لوشن تھے جن کا استعمال وہ بڑی کشادہ ولی سے کرتا تھا۔ وہ کینیڈا کے کسی یہی کلینک کا ثریہ نہیں کیورسٹ تھا اور لاہور میں اپنا کلینک کھولنا چاہتا تھا۔ لاہور میں اس کے پاس اتنا کام تھا کہ اگر وہ ایک کے بجائے چار کلینک کھول لیتا پھر بھی اس کی گاہکی ختم نہ ہوتی لیکن کسی وجہ سے اس نے اپنا زاتی کلینک نہ کھولا اور ایک روز جب میں اس سے اپنائیں لینے گیا تو وہ باتا شوروم سے اپنا کاروبار چھوڑ کر جا چکا تھا اور اس کے احوال و آہار کسی کو بھی معلوم نہیں تھے۔

شباب کے پاؤں کے ناخن بڑھ رہے تھے اور بل کھا کر اندر کو گھے جا رہے تھے۔ ناخنوں کی درجخی کی وجہ سے پہلے اس نے بوث چھوڑ کر بلکی کوبائی چیل پہن کر دفتر جانے لگا۔ پھر صرف جرایں پہن کر موڑ میں بیٹھ جاتا اور جرایں پہنے لفٹ میں سوار ہو کر اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھ جاتا۔ میں نے اسے فون کیا کہ فوراً لاہور آ جاؤ یہاں کوئی بندوبست ہو جائے گا۔ میرا راہدہ اسے بوڑھو والے نائی کے پاس لے کر جانے کا تھا جو نہر نے کام خوب جانتا تھا۔ وہ ہمارے ہوشیار پور کا نائی تھا۔ پاکستان بننے کے بعد پسلے سا ہیوال کام کر تارہ پھر لاہور آگیا۔ اس کا ہاتھ و سہ لگانے، ناخن کاٹنے اور خط بنانے میں بڑا صاف تھا۔ جب شباب لاہور آیا اور میں نے اس کی جرایں کھلوا کر دیکھیں تو اس کے دونوں انگوٹھوں کی حالت غیر تھی۔ پنجے سوچے ہوئے تھے انگلیاں موٹی ہو گئی تھیں اور چلتے وقت وہ

صرف ایزوں پر بوجہ ڈال کر چل سکتا تھا۔ میں نے اسے پنگ کی پٹی پر بھایاں تکیہ فرش پر ڈال کر اس کی ایزوں کے نیچے رکھا اور اس کے سامنے قائم پر بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں انگوٹھے آماں کی وجہ سے گرم ہو رہے تھے اور ان سے چنگیں سی پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اس کے دونوں انگوٹھوں کو ایک ساتھ اپنی پولی سی چنگی میں دبا کر دیکھا تو اس نے درد کے مارے دونوں پاؤں پیچھے کھینچ لئے۔ میں نے دونوں پاؤں مضبوطی سے پکڑ کر پھر تکیہ پر رکھ لئے۔

میرے پاس اٹلی کے زمانے کا ایک ناخن گیر تھا جو پلاس کی طرز کا تھا اور جس کے اندر ایسا پرنسپ لگا ہوا تھا جیسے شانگیں کاٹنے والی قبضتی کے اندر لگا ہوتا ہے۔ اس نیل کمری چونچ کے ساتھ میں نے بڑی احتیاط سے اندر گئے ہوئے ناخن کا ایک کونہ کا ٹاؤش اسے سانس چھوڑ کر کہا ”واہ جی وا۔ ٹھنڈ پڑ گئی“۔ مریض سے ایسا حوصلہ افزار مارک سن کر میری ہمت میں اضافہ ہوا اور میں نے ناخن کے دوسرے کنارے کو بھی نیل کمری چونچ میں پکڑ لیا تو تکلیف کی وجہ سے شاب کے چہرے پر شدید کرب کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس نے منہ سے کوئی آواز نہ نکالی۔ جب نیل کمری تک کر کے یہ کونہ کا ٹاؤس نے اپنا جیر جلدی سے نیچے کھینچ لیا اور اس پر کافی سارا بوجہ ڈال کر بولا۔ ”یہ چیر تو چلنے کے قابل ہو گیا۔ بالکل پر فیکٹ لیکن اب دوسرے کا کیا بننے گا“ میں نے کہا ”اتا تو دوسرا بھی ہو جائے گا۔ آگے کا علم مجھے نہیں آتا“ اس نے کہا ”دیکھو میاں میں ذیابیٹس کا مریض ہوں اگر خدا نخواست پاؤں پر کٹ لگ گیا تو زخم مندل نہ ہو سکے گا اور بات، لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے ذرا احتیاط سے کام لیتا۔“

میں نے اللہ کا نام لے کر دوسرے انگوٹھے پر بھی اسی احتیاط اور اسی توجہ سے کام کیا تو ادھر بھی ٹھنڈ پڑ گئی۔ جب اس نے اپنے دونوں پیروں پر کھرے ہو کر قائمین کے چاروں کناروں پر چل کر دیکھا تو اس کے چہرے پر وہی خوشی تھی جو پاؤں چلنے والے بچے کے چہرے پر اس روز ہوتی ہے جب وہ ڈمگ ڈمگ چلا تھا اور جس کے ماں باپ بھی نقیروں کی طرح ہاتھ پھیلا کر اس کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ میں اس کے ساتھ تو نہیں چلا البتہ میری مرتی ہوئی گردن اور گھومتی ہوئی نگاہیں قائمین کے چاروں کناروں پر اس کے ساتھ ساتھ چیلیں۔ جب وہ خوشی خوشی اپنا چکر کاٹ پکانوں میں نے اسے پکڑ کر پھر اپنے سامنے بھالیا اور اس کے نہ کرنے کے باوجود ناخنوں پر تنصلی آپریشن شروع کر دیا۔

مناسب اوزار نہ ہونے کی وجہ سے یہ آپریشن کوئی چالیس منٹ تک جاری رہا۔ جب میں اس کے ناخنوں کو فائل کر کے ان پر وغں زندگان لگا رہا تھا تو انقد سیہ اندر آگئی۔ مجھے اس طرح فرش پر اور شاب بھائی کو پنگ پر بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ پھر شاب نے کھیانے ہو کر

کہا "پیڈی کیورنگ ہو رہی ہے"۔

بانو نے آگے جھک کر دیکھاتوں میں ان گھوٹوں پر ماش ختم کر کے تابت والی نب سے ناخن کا کونہ اٹھا کر اس نے نیچے روئی کی چھوٹی سی ڈگنگی پھنسا رہتا۔ بانو میرے کمال فن کو دیکھ کر جیران رہ گئی اور کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بھیڑ گئی۔

اس کے بعد میں ہر جمعہ انارکلی میں پرانی کتاب بازاری سے ان رسالوں کو تلاش کرنے لگا جن میں ناخنوں کی حفاظت، انیں کائے رہانیں سیدھا کرنے، انیں تمیز سکھانے، راہ راست پر لانے اور گھر نے ہوؤں کا علاج کرنے کے طریق ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تمصا میں عورتوں کے ناخن رکھنے، ناخن رنگنے اور ناخن بڑھانے کے ملتے تھے لیکن کبھی کبھی کسی رسالے سے میرے مطلب کا مضمون بھی مل جاتا تھا۔

پیڈی کیورنگ پر دو کتابچے میں نے ولایت سے منگوائے۔ ایک بہت بڑا الیم متفرق مضمایں کی کنگ کا ہو گیا۔ جن دواؤں اور لوشنوں کے استعمال کی تجویز دی گئی تھیں وہ لوشن مقامی طور پر بنوالے۔ ایک ولایتی دوائی بھی مل گئی۔ اب معاملہ اوزاروں کی فراہمی کا تھا کیونکہ ہر میئنے ڈیڑھ میئنے بعد مجھے بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

دوہی میں میرا بھانجا جاوید طارق رہتا تھا۔ اس کو پیغام بھیجا کہ مجھے پاؤں کے ناخن کائے کے وہ آلات ولایت سے منگوا کر دے جن کی تصویریں اس پیغام کے ساتھ بھجوائی جاری ہیں۔ اس نے مطلوبہ اوزار تو منگوا کر نہ دیئے وہ اعلیٰ درجے کے "ٹیل کڑ" اور ایک سیٹ ناخنوں کی حفاظت کے آلات کا بھجوادیا۔

پاؤں کے ناخن کائے میں ہاتھ کی گرفت اور کمنی کے زاویہ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اوزار پر گرفت جس قدر مضبوط ہو گی کنگ اسی اعتماد کے ساتھ ہو گی کنگ صحیح ہو گی تو مریض کو تکلیف نہیں ہو گی۔ ہاتھ کے ذریسے ہل جانے سے گوشت میں گھے ہوئے کوئے تباہی مچا دیتے ہیں اور ڈر اس بات کا ہوتا ہے کہ مریض درد سے پاؤں کھینچ کر اپنے آپ کو زخمی نہ کر لے۔ ہاتھ کی گرفت صحیح نہ ہو تو ناخن کو نرم کرنے والا لوشن کڑ کے منہ کو پھسلابھی دیتا ہے۔ اس سے بھی حد اٹے کا خطرہ ہے۔ کمنی کا زاویہ ضرورت سے زیادہ اور ہو تو کڑ ناخن کو اوپر سے دباتا ہے اور بڑی شدید تکلیف میں بتلا کر دیتا ہے۔ کمنی پچھی ہو تو کڑ کا نیچے کا پھل زیادہ اندر کو جاتا ہے اور اوپر کا چھپھلتا ہو اپھل گرفت چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے بھی کچھ ماس کے زخمی ہونے کا نذر شد رہتا ہے.....

پاؤں کے ناخن کا ثابتہ اسی مشکل کام ہے۔ خاص طور پر کسی دوسرے کے کاثنا

جب میں نے دوسری مرتبہ شب کے ناخن کا نئے ان کو اچھی طرح سے ریتی لگا کر گولا یا۔ ان پر سیولون ملے آیلو آئیل کی ماش کی اور دونوں پاؤں کو تیز سینگ فین گی ہوا میں عکیہ پر چھوڑ کر ہاتھ دھونے گیا تو بانو میرے پاس غسل خانے میں آئی اور کہنے لگی۔

”شب بھائی مجھے دنیا میں بہت زیادہ عزیز ہیں اور یہ بھی ساری دنیا میں صرف مجھی پر اپنی بھروسہ شفقت کا اندر فرماتے ہیں، لیکن یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔“

میں نے ہاتھ دھونے چھوڑ کر ٹوٹی بندکی۔ گھوم کر اس کی طرف دیکھا اور جیرانی سے پوچھا ”کیا اچھا نہیں لگتا؟“

اس نے ردھی آواز میں کہا ”یہ سب کچھ۔ یہ جو آپ کرتے ہیں“  
”کیا کرتا ہوں میں“

”یہ جو آپ شب بھائی کے ناخن کا نہیں ہے۔ وہ بھی پیروں کے“  
میں نے کہا ”تو اس میں کیا ہے وہ میرا دوست ہے۔ جانی جان ہے۔ شدید تکلیف میں بتلا ہے اگر میں اس کی تکلیف رفع نہیں کروں گا تو اور کون کرے گا۔“

”تکلیف تو تھیک ہے“ بانو نے کہا ”لیکن آپ کا بھی تو معاشرے میں ایک مقام ہے دروازے چوڑ چپٹ کھلے ہوتے ہیں اگر آپ کے کوئی رشتہ دار آ جائیں۔ آپ کے بڑے بھائی صاحب..... یا میرے کنبے کے لوگ.....“  
”تو پھر آ جائیں“ میں نے خفی سے کہا۔

”اگر کہیں سے ادیبوں کو پہنچ جائے، صحافیوں کو، کالم نویسوں کو..... تو وہ ساری دنیا میں بدنام کر دیں گے۔“

”میں نے ان کا کیا لگاڑا ہے جو وہ بدنام کر دیں گے۔“ میں نے ذر کر کہا۔  
”لگاڑنے کی بات نہیں ہے“ بانو نے دکھ بھرے لبجے میں کہا ”وہ سب کو تباہیں گے کہ اشفاق احمد فرش پر بیٹھ کر قدرت اللہ شب کے پاؤں کے ناخن کا نہیں ہے۔“

”تو اس میں جھوٹ کیا ہے“ میں نے پوچھا۔

”میں کب کہتی ہوں کہ یہ جھوٹ ہے؟“ اس نے سمجھ کر کہا ”جھوٹ نہیں ہے جبھی تو کہہ رہی ہوں۔ کیا آپ یہ کام بند نہیں کر سکتے؟“

”بند کیسے کر دوں بانو۔ اور کوئی ہے ہی نہیں جو یہ کام کر سکے.....“  
میں نے بڑی محنت کے ساتھ یہ کام سیکھا ہے۔ کیا پتہ کل کسی اور کو اس کی ضرورت پڑ جائے؟۔ جب وہ کچھ دیر اور ساکت و صامت کھڑی بی تو میں نے کہا ”بھی اس میں برائی کی کیا بات ہے تم لوگ نہیں کیا کرتے اپنی دوستوں کے کام۔“

”اپنی دوستوں کے کام!“ اس نے جراثی سے پوچھا ”کون سے کام؟“ میں نے کہا ”تم سورنسیں ایک دوسری کے آگے بیٹھ کر سرمیں تسلی ڈلواتی ہو۔ سنتگھی کرتی ہو۔ جو میں نکلواتی ہو۔ اس وقت تم ساری بے عزتی نہیں ہوتی۔“

بانو نے کہا ”وہ تو گاؤں میں ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے تو اس طرح سے نہیں کرتے ہاں۔“  
ہم تو اپنے دوستوں کو برابر کی سطح پر شریٹ کرتے ہیں۔ ان کو تخفیف دیتے ہیں۔ ان سے تخفیف لیتے ہیں۔ ان کے ساتھ گھومتے ہیں۔ پارٹیوں پر جاتے ہیں۔ ہونگ کرتے ہیں ان کی بیمار پر سی کرتے ہیں لیکن ان کی تجارت داری تو نہیں کرنے بیٹھ جاتے۔ کسی کی زچہ گیری تو نہیں کرتے۔ دوستوں رشد داروں کے پاؤں میں کدو تو نہیں جھٹھنے بیٹھ جاتے۔ اس کے لئے معاشرے نے الگ الگ شعبے قائم کئے ہیں۔ نر سیسیں ہیں، میڑنی ہوم ہیں، بیوی پارلر ہیں، مساجرز ہیں، گیٹ ویل کار ڈریز ہیں، ویل فیر کی خصوصی تاریں ہیں۔“

میں نے کہا ”مجھے ابھی تک دوستوں عزیزوں کو دینا گھتنا، ان کے ہاتھ دھلانا، سر جھسنا اچھا لگتا ہے۔“

بانو نے درد مندی سے کہا ”آپ اس کام کو تھوڑی دیر تک روک نہیں سکتے۔“  
”روک سکتا ہوں“ میں نے کہا ”لیکن کب تک۔“

”ہمارے بچوں کی شادیوں تک..... جب رشتے ملے پا جائیں اور شادیاں ہو جائیں تو پھر شوق سے یہ کام شروع کر دیتا۔“

ہم ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر بڑی دیر تک اس موضوع پر بات کرتے رہے۔ دلائل کے سلسلے میں باونقد سیہ کا پلہ بھاری تھا اور میں تقریباً خاموش ہی تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں کسی کی خدمت کرنے یا کسی کی مدد کرنے سے منع نہیں کرتی۔ لیکن ہم اویب لوگ ہیں۔ رائٹر ہیں۔ ہمارا کام لکھنا ہے، انفرادی مدد کرنا نہیں ہے..... ہمیں معاشرے کی اور حکومت کی اور تجویز پیش کرتا ہے جو آڑے وقت میں لوگوں کی، مفلوک الحال اور درد مند لوگوں کی مدد کر سکیں۔ ہمیں اور سکول کھلوانے ہیں اور ہسپتال بنانے ہیں۔ یہ نہیں کرنا کہ ہم خود محلے کے لڑکوں کو پڑھانے بیٹھ جائیں۔ خود اپنے عزیزوں کے ناخن کاٹنے بیٹھ جائیں۔ خود ان کی مرہم پیٹ کرنے لگ جائیں۔ ہمیں صرف ذہنوں میں انقلاب لانا ہے۔ نظریات میں تبدیلی پیدا کرنی ہے۔ خود لکڑھارے نہیں بن جانا۔ ہاتو!“

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا اور وہ بڑی درد مندی سے کہہ رہی تھی کہ ہمیں

اپنے گھر کے ماحول کو بھی بد لانا ہو گا اور اپنے ملک کو بھی دلیل فیزیو شیٹ بناانا ہو گا۔ ہمیں تعلیم کا، صحت کا، ملازمت کا، انشورنس کا، پیدائش کا، موت کا، کفن و فن کا سارا ابو جھ معاشرے پر ڈالنا ہو گا اور کنبے کو گھر انے کو خاندان کو ایسی مصیبتوں سے نجات دلانا ہو گی۔ ہمیں یہ کتبہ ستم اور برادری ستم ختم کرنا ہو گا..... دیکھو تو ان یہ ہمارا فرض تو نہیں کہ ہم کسی کے مزے ہوئے ناخن کاٹتے پھریں۔ یہ تو حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر بڑے شرمنی پذیری کیورنگ کلینک قائم کرے اور دیکھی لوگوں کی مدد کرے۔

میں نے بانو کی یہ باتیں بڑے غور سے سنیں اور سب کو ایک ایک کر کے اپنے دل میں جگہ دی لیکن چونکہ میری بی۔ اے تک کی بیک گراڈنڈ بالکل دیساتی ہے اس لئے میں بانو کی باتوں پر من و عن عمل نہ کر سکا اور ناخن کاٹتے وقت دروازے بند کر کے اور کنڈی چڑھا کر یہ عمل کرنے لگا۔

ایک روز شام کے وقت جب میں دروازہ بھیڑ کر شاب کے ناخن کاٹ رہا تھا تو دھڑک سے دروازہ کھلا اور بانو قدیسیہ کی قیادت میں میرے بڑے بھائی، میری بھابی، ان کے دونوں بیٹیے، بیٹوں کی بیویاں اور ان کے ساتھ ان کے بچے ایک ہجوم کی ٹھکل میں اندر داخل ہوئے۔ میں کنڈی لگانی بھول گیا تھا۔ شاب نے کھیانا سا ہاتھ انھا کر میرے بھائی سے مصافح کیا۔

میں نے نگاہیں اور اٹھائے بغیر اپنی بھابی سے کہا ”اس کے ناخن اندر کو مرجاتے ہیں اور گوشت میں پیوست ہو کر خون نکال دیتے ہیں تو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ میں ذرا ذرا اس کی مدد کر دیتا ہوں“۔ لیکن میرے ارد گرد پوری کٹ کھلی ہوئی تھی۔ اس میں ناخن کاٹنے والے اوزاروں کے علاوہ چھوٹی بڑی گول ریتیاں، چوڑے، سُر نے، لوشن، کریمیں، سیولون، ٹیوول آئندہ شیٹ کی ٹیویں، محدث شیٹ اور گھڑی ساز کا آنکھ کو لوگا کرو کیختے والا شیٹ بھی موجود تھا۔ بھائی جان کی ایک بھونے شرارت سے مسکرا کر کہا ”چچا! یہ ذرا ذرا اولی مدد ہے! اتنا سامان تو ننگ یا نگ یوٹی پارلر میں بھی نہیں ہوتا“۔

بانو نے کہا ”ابھی دو چیزیں کم ہیں۔ وہ آجائیں گی تو شاب بھائی کو اور بھی آسانی ہو جائے گی۔ ابھی جب ہم کچھی پر ناخن کا کونہ اٹھاتے ہیں تو ان کو بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ان کو ذرا ابھی تکلیف نہ ہو“۔

شاب بت دہم، بت دھیئے، بت جھپٹو آدی تھے۔ چور سے بنے صوف پر بیٹھے رہے۔ میرا سارا گھر ان ان کے گرد گھیراڑاں کر کھڑا رہا اور میں قالین پر پھیلی ہوئی چیزیں ایک

ایک کر کے کٹ میں ڈالتا رہا۔ بچوں نے انہیں ٹھہرے مار مار کر ان سے کھلینا شروع کر دیا تھا۔ دنیا کے بڑے کام اور بڑے فیصلے کچھ عجیب و غریب طریقے پر ملے ہوتے ہیں۔ ان میں عقل و دانش، فلسفہ اور منطق، دلیل و برهان کا کوئی خل نہیں ہوتا۔ ان کے ساتھ کوئی تجویز یا پلینگ بھی نہیں ہوتی۔ جس طرح آج تک میں کسی حلقة، کسی سلسلے یا کسی رابطے میں یا اپنے تقاضوں اور نکتہ درودوں کے سامنے کبھی کوئی دلیل پیش نہیں کر سکا۔ تقاضوں کے پوچھنے پر کہ فلاں کمانی کے فلاں کردار میں اچانک یہ تبدیلی کیوں رونما ہوئی۔ یافلاں ڈرامے میں یہ انسوںی بات کدھر سے آگئی تو مجھ سے اس کا کوئی شانی جواب نہیں بن پڑتا۔ ممتاز مفتی اور بانو قدسیہ تو بتتی چھوٹی انسان ہیں۔ حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر صحابی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان میں اچانک تبدیلی کیوں پیدا ہو گئی؟۔

یہ باتیں ہوئیں، ہو چکیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ میرے سامنے کی باتیں ہیں۔ آنکھوں دیکھی۔ مشاہدے سے گذری لیکن میرے پاس کوئی ولیل نہیں۔ کوئی جواز نہیں۔ کوئی دفاحت نہیں۔ کسی قسم کی جوابدی نہیں۔ اگر میں سارے زمانے کی بولیاں بولوں اور سارے الفاظ پر قدرت رکھوں اور ساری جزئیات کا سالک ٹھہروں پھر بھی میں آپ کو الفاظ سے بیان سے، حرکات و سکنات سے، رقص سے، پینٹنگ سے چائے کا ذائقہ نہیں تلاستک۔ چائے کے رنگ سے اس کی خوبیوں سے اس کی حدت سے آشنا نہیں کر سکتا۔ شاید یہ آپ کی مجبوری نہ ہو لیکن میرا بعمر ضرور ہے کہ میں علم سے اور ابلاغ سے آگاہی حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ کچھ اور ہی شے ہے جس سے نکلنے کا اور تدبیر کا حکم دیا گیا ہے۔

اب شاب صاحب کے آنے پر بانو قدسیہ کی اوپنی فکر یہ ہوتی تھی کہ سب سے پہلے ان کے ناخن کاٹے جائیں پھر ان سے چائے کے لئے پوچھا جائے۔ وہ ان سے پوچھے بغیر میری کٹ اٹھا کر لاتی تو شاب مسکرا کر کہتے ”بانو ہر مرتبہ ناخن تراش کی ضرورت ہوڑی ہوتی ہے۔ مینے ڈیڑھ مینے بعد ایک صحیح عمل ناخن تراش کافی سے زیادہ ہوتا ہے۔ ابھی میں آسانی سے جل لیتا ہوں، سخت بوٹ پکن لیتا ہوں، ابھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگلی مرتبہ سی“۔ لیکن بانو میری جان عذاب میں ڈالے رکھتی کہ تم ایک مرتبہ ناخن دیکھ تو لو۔ ان کامعاں نے تو کرو شاید کوئی کو ناکنارا کاٹنے کے قابل ہی ہو۔ کہیں ریتی لگانے کی ضرورت ہی ہو اور شاب بھائی ٹکف سے کام لے رہے ہوں۔ وہ شر میلے آدمی ہیں۔ زور دے کر نہیں کہیں گے۔ مجھے مجبوراً پاؤں کا ڈاکٹری معافانہ کرنا پڑتا اور پھر زبانی سڑیقیت جاری کرنا پڑتا کہ فی الحال ضرورت نہیں۔ پندرہ سے بیس دن کے اندر اندر آپریشن ضروری ہو جائے گا۔

معالج کے ہاتھوں میں مریض ایک عجیب طرح کا قیدی ہوتا ہے۔ وہ خود تو ممنون احسان ہوتا ہے اس کے عزیز دقارب، دوست، رشتہ دار، ملائقی اور لو احیثیں بھی معالج سے مرعوب ہو کر اس کے سامنے گھٹھیا نے سے لگتے ہیں۔ میں بیٹھتا تو اس کے پاؤں میں تھا لیکن میری ہمراہی کی بنا پر شہاب کا سارا خوش قبیلہ میرا شکر گزار تھا اور ان کے بیان میرا قیام بالکل ایسا ہوتا جیسے نواب بھوپال کے بیان حکیم اجل خان کا ہوتا تھا۔ ایک روز اپنے بھائی بھجوں کو میری خدمت میں مصروف پا کر اور اپنی بھیشہ کو میرے لئے خصوصی کافی بنا کر لاتے دیکھ کر اس نے اپنی خصوصی دھیمی آواز میں کہا ”بڑی لمبی دوستیاں دو رنگ کم ہی چلا کرتی ہیں۔“

میں نے کہا ”نہیں..... ضروری نہیں..... چل بھی جاتی ہیں۔“

اس نے اپنے قریبی حلقوں میں سے دو جگری یاروں کا نام لے کر کہا ”اب دیکھو ان کی دوستی بھی تو چالیس پیتا لیس سال پرانی تھی۔“

”تھی، کا کیا مطلب“ میں نے پوچنک کر پوچھا۔

”تھی کا یہ مطلب“ اس کی آنکھیں شرات سے جگد گانے لگیں ”کہ اب ان میں دوستی کا رشتہ باقی نہیں رہا اور انہوں نے ایک دوسرے سے بولنا بند کر دیا ہے۔“

”لیکن چند روز پہلے تو میں نے ایک ولیے پر اکٹھے دیکھا تھا۔“

”اس میں تم تھوڑی سی صرف کی غلطی کر گئے ہو“ شہاب نے لہرا کر کہا۔

”تمہارے اس فقرے میں اکٹھے کا لفظ بے جا استعمال ہوا ہے اور بیان میں ذرا ساختہ پڑ گیا ہے۔ وہ دونوں ولیے پر موجود ضرور تھے لیکن اکٹھے نہیں تھے۔“

میں نے کہا ”یہ کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ وہ ایک ہی میز پر بیٹھیں جوڑ کر ایک ہی

انداز میں اوپھی چوٹی والی بریانی کھارے ہے تھے اور اوپھی اوپھی بول رہے تھے۔“

”آپس میں؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا ”نہیں آپس میں تو نہیں دوسرے دوستوں سے بول رہے تھے جو سامنے کھڑے تھے۔“

”تمہیں ان کی گفتگو کا مضمون یاد ہے؟“ شہاب نے پوچھا۔

میں نے کہا ”کچھ بکھرے بکھرے سے مضمون تھے کچھ بہکی سی بنکاریں تھیں۔ میں

نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔“

”وہ جو بکھرے بکھرے سے مضمون تھا“ شہاب نے کہا ”وہ سامنے دوستوں کے

لئے نہیں تھے پیشہ بھی کھڑے یار قدیم کے لئے طفر کے تازیانے تھے۔ اب وہ باقاعدگی سے بر  
محفل میں جاتے ہیں اور ایک دوسرے کو سب کے سامنے ضرب شلاق کرتے ہیں"۔  
میرا منہ حریت سے کھلا رہ گیا اور مجھے شہاب کی بات کا یقین نہ آیا۔ پھر اس نے میز کی  
وراز میں سے ان میں سے ایک دوست کا خط نکالا اور میری طرف پہنچتے ہوئے بولا "اس نے  
حال ہی میں سوف کافیتہ خریدا ہے"۔

"فیتہ؟" میں نے اور حریت سے پوچھا۔

تو شہاب کرنے لگا "دوسرے دوست کو حال ہی میں سرکار کی طرف سے ایک پاٹ ملا  
ہے اور وہ اس پر اپنی کوٹھی بنوارہا ہے۔ آو ہی رات کے وقت فیتہ والا دوست اپنی کار میں بیٹھ  
کر اس کے پلاٹ پر پہنچتا ہے اور اس کے پلاٹ کو ناپتا ہے اور پھر بلبلہ کرتا ہے۔ حرامزادے  
پھو کو ایک سوسائٹھ فٹ فرنٹ کا پلاٹ ملا ہے۔ کیوں نہ ملے دودو لکھ کے افسروں کی خوشامد جو  
کرتا رہا ہے۔ ان کی جوتیاں جو جھاڑتا رہا ہے اور ان کے بچوں کے منہ جو پونچھتا رہا ہے"۔ پھر  
وہ پلاٹ کے اندر اٹھتی ہوئی دیواروں کی لمبائی چوڑائی اور موٹائی کامپ لیتا ہے اور گاگا کر کتنا  
ہے "بپ پھتو کھمار، بینا مغل شہوار، ایک ایک فٹ کا سارا اسار۔ نوچی کی نہیں کوئی  
دیوار، اور ایک آدھ گھنٹہ لگا کر، سارے Dimensions نوٹ بک میں لکھ کر واپس گھر چلا جاتا  
ہے"۔

میں نے کہا "تمیں کیسے معلوم ہے؟"۔

"مجھے چوکیدار نے بتایا ہے جو پلاٹ کی گمراہی پر مامور ہے"۔

میں نے کہا "کب گیا تھا فیتہ شیپ لے کر؟"۔

کرنے لگا "کب کیا بھائی۔ ہر رات جاتا ہے اور ہر رات ناپ لے کر آتا ہے۔ البتہ  
اپنے گانے میں مغلظات کا اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اب تو اس کی ہزلیات چوکیدار کو بھی یاد ہو گئی  
ہیں"۔

میرے لئے یہ ایک انوکھی اور ان ہوئی بات تھی۔ اور مجھے اس پر یقین نہیں اُراہتا۔  
اصل میں شہاب کا واقعہ تو یہ شے سچا ہوتا تھا لیکن اپنے بیان میں وہ مبالغہ آرائی ضرور کرتا تھا۔  
تصویر تو ٹھیک ہوتی تھی لیکن وہ اسے فرمیں کئے بغیر آؤ زیاد نہیں کرتا تھا۔ میں اس کے ان دونوں  
دوستوں سے بہت اچھی طرح سے واقف تھا بلکہ میں نے ان کی مثالی دوستی کو شہاب سے بھی  
زیادہ قریب سے دیکھا تھا۔ ان کی پچاس سالہ قدیم دوستی اس قدر گھری تھی کہ وہ اپنی کوئی  
بات "کوئی راز، حتیٰ کہ اپنا کوئی عضو بھی دوسرے سے پوشیدہ نہ رکھتے تھے۔ دوپر کے وقت وہ

ماورے زادہ برہنہ ہو کر لئے کھایا کرتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لباس پہننے سے انسان میں منافقت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حق سے اور حقیقت سے اور اخلاص سے دور ہو جاتا ہے۔

ایک مرتبہ جون کی بھری دوپہر میں ریڈ یو شیشن سے اٹھ کر میں بھی کسی کام سے ان کی طرف گیا تو ان کو لمحہ کرتے دیکھا۔ میں نے تصویریوں میں تو خوبصورت قسم کے کئی برہنے و جود ویکھے تھے لیکن ویچنگ کے تخلیقیاتے، نسواری رنگ کے بڑھے و جو واس طرح سے بھیجا کے مارتے نہیں ویکھے تھے۔ میری گھبراہٹ پر وہ دونوں یک زبان ہو کر بولے ”بیٹھ اونے کھدر پوش منافق انسان“ اپنے بدن اور اپنے عیوبوں کو اور گناہوں کو چھپانے والے! بیٹھ اور روٹی کھا۔ میں ان کے رعبِ حسن سے ایسا خوفزدہ ہوا کہ کرسی کھینچ کر لئے میں شریک ہو گیا۔

خانہ میں پہلے کپاکا کر لارہا تھا اور بس آنا جانا ہی کر رہا تھا..... اس نے سر پر ایک چوخانہ رومال پیٹھ رکھا تھا جس کی ایک لمبی سی جھا لراس کی آنکھوں پر گردی ہوئی تھی۔ وہ بس اندازے سے ہی میز تک پہنچتا تھا اور اندازے سے ہی روٹی رکھ کر واپس چلا جاتا تھا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اتھے میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو انہوں نے جلا کر کہا ”یہ اس وقت کون منافق آ گیا!“ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو فیض صاحب کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے ذرا سی تقویت ملی اور میں نے جلدی سے کہا ”آ جائیے فیض صاحب آ جائیے..... دونوں حضرات تشریف رکھتے ہیں۔“

فیض صاحب کا گھر ریڈ یو شیشن کے عین سامنے تھا۔ وہ بھی میری طرح تیز دھوپ میں پیل چل کر آئے تھے اور ان کے تمثالتے ہوئے گالوں پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے پیچھے سے آنے والے کسی اور موٹے قطرے کے انتظار میں کھڑے تھے، انہوں نے داخل ہوتے ہی اپنے مخصوص لباس میں کہا ”بھی تم سے ایک مشورہ کرنا تھا کیونکہ ہم کو تو ان قانونی باریکیوں کی سمجھ نہیں ہے.....“ اور پھر جب دھوپ میں چند ہیلائی ہوئی آنکھیں کمرے کی روشنی سے ماوس ہوئیں تو فیض صاحب نے اونچی آواز میں لاحول ولا قوۃ الابالند پڑھا اور نعوذ باللہ ”نعوذ باللہ“ کہتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے۔

ان دونوں دوستوں نے مل کر زور کا نفرہ مارا اور کہا ”بھاگ گیا لابھاگ گیا مولانا.....“

اپنی عربی شریف ساتھ لے کر ”مجھے بھی مجبوراً ان کے ساتھ مل کر بہتنا پڑا کیونکہ وہ بار بار مجھے منافقت اتار دیتے کو کہتے تھے اور میں بار بار کسی کہہ رہا تھا کہ اگلی مرتبہ آیا تو تاروں گا۔

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان دونوں کے درمیان تفرقہ پڑ گیا ہے جن کو میں نے ایک

وسرے کے قریب خود اس قدر قریب سے دیکھا تھا۔

شہاب صاحب نے کہا ”دیکھو بھائی میں نے یہ ساری تفصیل ایک ذاتی غرض مندی کے تحت فراہم کی ہے۔ اور وہ ذاتی غرض یہ ہے کہ آگے چل کر جب ہمارے درمیان تنفر قپیدا ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے گھر ناپنا شروع کر دیں“ اور ہماری دوستیاں دشمنیوں میں بدل جائیں تو تم میرے ناخن کا ثنا ترک نہ کرنا کیونکہ اس کام کا ماہر پاکستان میں اور کوئی ہے نہیں اور میں اس مغدوری سے لاچا رہو کر چل پھر نہیں سکوں گا۔“

میں نے کہا ”جب دوستی دشمنی میں اور رشتہ داری شریکے میں تبدیل ہو جائے تو پھر میں یہ خدمت کیسے سرانجام دے سکتا ہوں“ -

”بالکل اسی طرح“ شہاب نے یقین سے سرہلا کر کہا ”جس طرح ہمارے باپ دادا کرتے تھے۔ آپس میں سرد ہڑی کی بازی لگی ہوئی، ایک دوسرے پر چھ چھ مقدمے کئے ہوئے، لیکن پیشی بھٹکنے کے لئے جانا ایک ہی یکے میں۔ پھری میں روٹی ایک ہی ہوٹل سے کھانی اور کھانے کے پیسے بول کر کے دینے..... اس طرح سے ہم کر سکتے ہیں“ -

میں نے کہا ”شہاب صاحب یہ ذرا مشکل کام ہے۔ میں مفتی صاحب کا تربیت یافتہ پڑھا ہوں اور ان کا اصول ہے کہ جب کسی سے توڑوی تو پھر توڑوی۔ دوبارہ تعلق پیدا نہیں کرنا۔ شاید میرے لئے یہ ناممکن ہو جائے کہ اصل میں تو ہماری بول چال بند ہے اور میں ناخن کاٹنے کے لئے باقاعدگی سے آپ کوں رہا ہوں“ -

شہاب نے بڑی لجاجت آمیز لمحہ میں کہا ”میں یہ درخواست سنجیدگی سے کر رہا ہوں اور اس میں میرا خوف بھی شامل ہے۔ تم بس یہ سمجھو کر مجھے گویا کینسر ہے اور اس کا علاج صرف تمہارے پاس ہے“ -

اس نے منہ بھر کے ایسی بیماری کا نام لے دیا کہ میرے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ میں نے ان کا کندھا تھپتھپا کر بڑے مریبانہ انداز میں کہا ”فکرنا کرو۔ ویسے ہی ہو گا جیسے تم کہتے ہو“ -

افوس کہ اس لمبی مدت کے درمیان وہ خوشنگوار گھڑی ایک مرتبہ بھی نہ آئی جس کا مجھے انتظار تھا اور اس کو دھڑکا تھا..... اصل میں شہاب کا تعلق مجھ سے کم اور میرے بچوں سے زیادہ گھر اہو گیا تھا۔ پچھے جب ایک مرتبہ کسی کو دل سے مان لیں تو ان کو بد ظن کرنا کافی مشکل ہو جاتا ہے۔

میرے دل میں بیٹھے بیٹھے یہ تمنا کئی مرتبہ پیدا ہوئی کہ میرے اور شہاب کے درمیان

دشمنی کی گھری خلیج پیدا ہو گئی ہے..... میں نے اس کے خلاف خفیہ طور پر کئی خط اخباروں میں چھپوائے ہیں اور صحافی دوستوں سے مل کر اس کے خلاف کالم بھی لگوائے ہیں۔ اس کے وہ خط بھی جید نقادوں کے حوالے کر دیئے جو اس نے مجھے لکھے تھے اور جن میں ایام جوانی کے نوش جملے بھی بار بار آتے تھے۔ اس نے بھی میرے مشرکو ایک ذمی۔ اولکھ کر مجھے نوکری سے نکلوانے کی کوشش کی۔ میری مشری سے کما کہ ذرا اس بات کی تحقیق تو کریں کہ یہ شخص ہر حکومت میں بدستور اسی نوکری پر چلا آ رہا ہے اور اس کی ملازمت ختم نہیں ہوتی ہے۔ اس اثناء میں مجھے اس کا پیغام ملتا ہے کہ ”اب چلنے پھرنے سے معدود ہو گیا ہوں۔ کل لاہور آ کر ناخن کٹوانے چاہتا ہوں۔ تم کہیں چلنے جانا۔“ میں جواب بھجوتا ہوں کہ کل نہ آنا۔ پرسوں آ جانا۔ کل مجھے ایک ضروری کام ہے۔ اور ضروری کام (جس کا میں اسے علم ہونے نہیں دیتا) یہ ہے کہ مجھے اکٹم نیکس والوں کو اس کے اس بُنک اکاؤنٹ کا نمبر فراہم کرنا ہے جس کا اس نے اپنی اکٹم سیٹ منٹ میں آج تک ذکر ہی نہیں کیا۔

وقت مقررہ پر شاہب آتا ہے۔ میں اندر کون کے کمرہ نمبر ۲۲۳ میں جا کر اپنے اوزار نکالتا ہوں۔ وہ سلام کرتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا۔ وہ پاؤں آگے پھیلا دیتا ہے۔ میں اسی توجہ اور اسی انہماک سے اس کے ناخن کا ناخن کاتا ہوں۔ وہ تھینکن یو کرتا ہے۔ میں اس کا جواب نہیں دیتا۔ وہ مجھے لفت تک چھوڑنے آتا ہے۔ میں پیچھے مرکر نہیں دیکھتا۔ وہ کمرے میں واپس جا کر اپنے ناخنوں کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ اچھا ایک آدمی کو الوبنا یا ہے۔ میں دفتروں میں جا کر پرانے رجسٹر دیکھتا ہوں کہ مسمی قدرت اللہ شاہب کو کسی وقت کوئی ”ٹوٹا اراضی“ تو الات نہیں ہوا۔

لیکن میری یہ تمنا پوری نہ ہو سکی اور شاید اس کی خواہش بھی بیچھی میں رہ گئی اور ہم دونوں کے خواب چکنا چور ہو گئے۔

ایک مرتبہ شام کے وقت شاہب صاحب نے اسلام آباد سے فون کر کے کہا ”بانو! میرے ناخنوں کی تکلیف بڑھ گئی ہے۔ آسانی سے چل پھر نہیں سکتا۔ مسجد بھی نہیں جاتا۔ صرف جرایں پہن کر بیٹھا رہتا ہوں۔ تم خلیفہ کو ایک دن کے لئے بھیج دو کہ آکر میرے ناخن کاٹ جائے۔“

میں رات کو دیر گئے گھر واپس آیا تو باقدیسہ ابھی جاگ رہی تھی۔ اس نے شاہب خان کو فون کر کے میرا اسلام آباد کا نکٹ بھی بنوالا تھا۔ میرا بیگ بھی تیار کر دیا تھا اور اشیر خان کے سرہانے الارم لگا کر گھری بھی رکھ دی تھی کہ صبح اٹھ کر مجھے ایز پورٹ چھوڑ آئے۔

اگلی مرتبہ جب شہاب صاحب لاہور آئے تو بانو نے اپنے بچوں کو ان کے پاس کھڑا کر کے اور ان کے چہرے ان کی طرف انہوں کے کما "شہاب بھائی! اس وقت ہم سب کے سامنے وہ اعلان کریں جو آپ نے اسلام آباد سے فون پر کیا تھا"۔

انہوں نے شربا کر سر جھکایا اور خاموش ہو گئے۔ بانو نے دو تین مرتبہ بڑی بینتی کے ساتھ اصرار کیا تو انہوں نے کچھ پڑ کر بڑے دھنے لجھے میں کما "میں نے یہ کہا تھا اشراق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میرے خلیفہ کو ایک دن کے لئے میرے پاس بیچ دو"۔ پھر انہوں نے ذرا رُک کر کہا

"میں اس کے لئے اور اس کے گھرانے کے لئے دعا کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرتا ہوں کہ وہ اس گھرانے کو خیر کیش عطا فرمائے"۔

بانو قدیسہ خوشی سے لبرز ہو کر سکیاں بھر کر رونے لگی اور اس کے چہرے سے ساری کلفتیں اور ساری بیماریاں ایک ساتھ دور ہو گئیں۔

تیس جولائی کو ان کی بھانجی گذی نے فون پر مجھے اطلاع دی کہ "ماموں جی اچھی طرح سے چل پھر نہیں سکتے۔ آپ جلدی سے آ جائیں"۔

میں اوزاروں کو اچھی طرح سے ابال کے اور پھر سیلوں میں لٹھز کرنے لعشوں بنانے لگا۔ شاہد خاں نے آ کر بتایا کہ جہاز میں کوئی سیٹ نہیں ہے۔ ریکوئٹ پر بھی اخبار ہواں نمبر ہے، اس لئے آپ گاڑی پر ہی جائیں اور صحیح ہی صحیح روانہ ہوں۔

میں صحیح ہی صحیح گاڑی پر نکل گیا تو اسلام آباد میں شہاب کے گھر کے گیٹ پر لوگوں کا بڑا جمع تھا۔ لان پر ایک بڑا ستبنہ تھا۔ کچھ لوگ کھڑے تھے۔ کچھ بیٹھے تھے۔ کچھ موڑوں سے نکل رہے تھے۔

گذی نے آ کر مجھ سے پٹتے ہوئے کہا "آؤ چا آپ کو ماموں جی کے پاس لے چلوں۔ اپنے کمرے میں ہی ہیں اور لیٹئے ہوئے ہیں۔

میں اپنے اوزاروں کی کٹ لے کر اس کے پاؤں کے پاس کھڑا کر میرا اور اس کا مقابلہ تھا کہ جب ہم ایک دوسرے سے ناراض بھی ہو جائیں اور ہمارے درمیان تفرقہ بھی پیدا ہو جائے اور ہم ایک دوسرے کے دشمن بھی بن جائیں، پھر بھی میں اس کا خلیفہ ہی رہوں گا اور اس کے ناخن اسی طرح سے کانٹا رہوں گا جیسے اب تک کانتا آیا ہوں۔

میں نے اپنی کٹ اوپر اٹھا کر کہا "ناخن کٹوالو" لیکن وہ بولا نہیں

میں نے پھر کہا ”ناخن نہیں کٹوائے تو کم از کم ان کے کونوں پر تین ہی لگوالو“۔

لیکن اس نے میری اس بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیا..... میں نے اپنے اوزار اس کے کمرے میں رکھ دیئے اور باہر آ کر شامیانے تلے بیٹھ گیا جہاں لوگ آہستہ جمع ہو رہے تھے۔

اس مضمون کو پڑھ کر آپ کو خود ہی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اشفاق کے دل میں شاب بھائی کے لئے کیسی، تکنی اور کس طرز کی محبت تھی۔ لیکن میں آج تک ان دونوں کے رابطے کو سمجھ نہیں سکی۔

ایک جانا منقصتی تھی کہ ہوتا ہے کہ افہام و تفہیم کے بغیر شد مضبوط نہیں ہوتا۔ ایک جان کاری خان صاحب کی ہے جیسے خوبیوں کے تعاقب میں حیات پر نکلیے کر کے آدمی محظوظ کے حضور پہنچ جائے اور ایک میراطریقہ ہے میں ہمدردی کا ہمار پون مار کر گرفتار کرتی ہوں۔ سدر شن چکر چلاقوں ہوں اور نرنگے میں لے کر دوسرا کو جانتی ہوں۔ رات کے دس بجے جب انسان تھکا ہار اور غمگین ہوتا ہے اس کے اعضا اپنے راز چھوڑنے لگتے ہیں چیتی کی طرح میرا جملہ ہوتا ہے۔ کسی کو جاننے کا میرا یہی نہیں ہے کہ آپ اس کے راز جانیں۔ اس سے اتنی ہم نفسی کریں کہ مدد اُنہوں نے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کا اور میرا ایک مغلوس رابطہ ہن جاتا ہے۔ ہمدردی ایسے میں جس سے میں واقفیت حاصل کرنا چاہتی ہوں اس کا اور میرا ایک مغلوس رابطہ ہن جاتا ہے۔ چاہئے والا میرے جاں میں مکڑی کی طرح پھنس جاتا ہے۔ وہ مجھ پر اس قدر Dependent ہو جاتا ہے کہ اس کے شب و روز میرے بغیر کئنے محال ہو جاتے ہیں۔ ہم صفتی چاہئے والے کی یہی معدود ری، مجبوری میری رو رکی غذا، میری مامتا کا چشمہ اور میری اناکی کھوٹی ہے۔

شاب بھائی کو ہم مرکزی کی ضرورت نہ تھی وہ اپنی آزادی سے اتنی محبت کرتے تھے کہ پوڈل بنانا کے لئے محل تھا۔ اسی لئے نہ وہ کسی کے راز معلوم کرتے ..... نہ کسی کے راز لگوا کر انہیں خوشی ہوتی۔ کوئی ان کے سامنے بیٹھ کر روتا ہے وہ بغیر وجہ معلوم کئے ہمدردی کے جاتے وہ خط مہماں کی طرح محض قطر پر رہ کر مدد کر سکتے۔ انہیں کسی کی رسی پکڑنے، کسی کو دست گیرنا نہ یا اپنے سے ہلاک ثابت کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ سر کاری دفتروں میں جہاں جہاں وہ کسی کی مدد کر سکے انہوں نے لکھا کیوں یو شباب اور مدد کر دی۔۔۔۔۔ جب کبھی کسی کو رقم کی ضرورت ہوئی انہوں نے منی آڈر پر لکھا کیوں۔ یو شباب اور رقم بصیرت دی ..... کسی کے مرگ ہو گئی تو وہ کیوں۔ یو شباب کو چھپا کر ساتھ لے گئے تاکہ مرنے والے کی ساکھ کم نہ ہو جائے۔ عیادت کو گئے تو کیوں یو شباب کو گھر چھوڑنے تاکہ مریض کی شمع خراشی نہ کرے۔ شادی کے ہنگامے میں شامل ہوئے تو کسی کو نہیں میٹھ کر کسی انجانے نہیں کے حوالے کیوں۔ یو شباب کو کر دیا میباوا اسے انٹریمین کرنے کا بوجھ گھروں کوں کے ذمے ہو جائے۔ دوستوں میں بیٹھنے لیکوں شہاب کو کھلا چھوڑ دیا تاکہ دوستوں کی حیانات طبع کے لیے وہ اپنے سفروں کی داستان نوکری کی رواداد بچپن کے داقتان

نائے..... نوجوانوں کو کیمپ یورشیاپ نے کبھی خوفزدہ نہیں کیا۔ نوکر بھی اس بڑے صاحب سے ڈرے نہیں۔ نادار بڑے عرب قوں کو معلوم ہی نہ ہوا کہ کیمپ یورشیاپ ایک ایسا افسر ہے جس سے خوفزدہ ہونا چاہئے۔

یہ بس لئے کہ خود آزاد رہ کرو کسی کی خود مختاری سلب نہیں کرتے تھے شاہ بھائی کسی کے دل میں پریمی اتار کر اتنا ہی نہ چاہتے تھے کیونکہ اترنے کے بعد قیام کرنے کی بھی ایک شرط ہوتی ہے اور وہ یہ شرعاً اس لئے برداشت کر سکتے تھے کیونکہ انہیں اپنی آزادی بست پیاری تھی۔

چونکہ مجھے اپنی تکنیک سے شاپ بھائی سے واقفیت حاصل نہ ہو سکی اس لئے میں نے غور سے ان کی عادات کا مانندہ لینا شروع کر دیا۔ اس میں کچھ مفتی جی کا اصرار بھی شامل تھا۔ وہ کماکرتے۔

”میں شاپ برس کرتا ہوں تم بھی کوشش کرو..... وہ کیا سوچتا ہے؟ کیا چاہتا ہے؟ اس کی نیت کیا ہے؟“  
میں شاپ برس کر تو نہ کر سکی لیکن میرا فوکس ان کی طرف ضرور ہو گیا۔

ویے بھی شاپ بھائی سے ہمدردی کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی اس لئے میں ان کو صرف دن کی روٹین کے حوالے سے جانے لگی، صحن ناشتے کے وقت میں انہیں پر اٹھا پا کر دیتی۔ اور یہ معمول ان تک تک ہلکی چلکی گفتگو اور چھوٹی سی رسائی کا باعث بناتا رہا۔

شہاب بھائی ایک مدت سے بہت پہنچانا شاہت کرنے کے عادی تھے۔ لیکن میری طبیعت میں کھلانے پانے کا اصرار بہت ہے۔ میں اپنے مہمان کو بے طور رزق کرنے کی عادی ہوں۔ شاید محفل میں نمایاں ہونے کی مجھے اس سے اچھی کوئی ترکیب نہیں آتی۔ کسی کو زیر بار کرنے کا اس سے مناسب طریقہ بھی مجھے نہیں آتا۔ اصرار ہی اصرار..... نمائش ہی نمائش۔ اتنا..... دکھلاوا ہی دکھلاوا اتنا ہی اتنا۔ کبھی بھونڈی ٹھکل میں کبھی بڑے شاہتے انداز میں..... لیکن ہمیشہ ہمدردی کے ہارپون کے ساتھ.....

پہلی مرتبہ جب میں نے شاب بھائی کے لئے پر اٹھا پکایا..... اسے شد اور ملائی کے ساتھ سامنے رکھا تو وہ ہو لے سے کسم سائے ، دونوں ہاتھ اٹھائے اور آہستہ سے بولے " یہ توبت زیادہ ہے ..... لیکن جب میری ہاتھ کا جو گوار بھانا چڑھتا ہے نومعقول اور نامعموق دنوں کو بھالے جاتا ہے۔

میں نے سمجھا میں عارفانہ سے کہا..... ”یہ زیادہ ہے جی؟..... میں ایک چھوٹا سا پکار دیتی ہوں.....“

”ناہ ناہ..... بالکل نمیں کیک ہے لیکن آپ اور نہ پاکائیں میں اور خان صاحب شیر کر لیں گے۔“  
لیکن میں کسی کو کب شیر کرنے دیتی ہوں؟ اس طرح تو وہ توجہ بھی شیر ہو جاتی ہے جس پر صرف میر احت ہوتا ہے۔ میری انصار ف آدھے کو برے کی طرح اٹھ نہیں سکتی۔

”نہیں شاپ بھائی..... ان کے لئے توے یرجو ہے.....“

شاب بھائی کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے تھے اگر وہ ٹھنڈا پانی مانگتے اور تین آدمی پانی کے بچ گلاس لے آتے تو وہ تینوں گلاس رکھ لیتے اور آہستہ آہستہ تینوں گلاسوں میں سے کچھ اس طرح پیتے کہ اگر خالی ہوتے تو

تینوں اور اگر بھرے رہتے تو تینوں ایک ہی سطح تک۔

پرانوں کا ناشتہ کرتے کرتے ایک دن انہوں نے کہا..... ”ماں جی اور میں جب جھنگ میں تھے تو وہاں ہم نے ایک بھینس پال رکھی تھی۔ میں صبح پرانے کے ساتھ مکھن کھایا کرتا تھا..... رفتہ رفتہ میری گردان غائب ہو گئی“، کہنے اور سر آپس میں جڑ گئے..... اور میں بالکل چورس نظر آنے لگا۔“

جب آخری مرتبہ وہ داستان سرائے آئے تو صبح کے وقت دو ایوں کی گولیاں نیلی ڈیبا سے نکال کر کوائز پلید پر رکھتے ہوئے انہوں نے کہا ”بس یہ میں آخری مرتبہ آپ کے گھر پہنچ پا ہوا کھرا ہوں.....“ - میں نے چونک کر پرانا ٹھوڑے پر چھوڑ دیا اور خال صاحب ازی خاموشی کا شکار ہو گئے۔ ”کیوں شاہب بھائی؟ کیوں؟؟.....“

انہوں نے ہماری تشیش بھانتپ کر کہا..... ”نہیں بات کچھ خاص نہیں ہے جب پچاس کی عمر آگئے تو ہر سال کوئی نہ کوئی مرغوب غذا چھوڑ دیتی چاہئے۔ میں اب دوبارہ جب آیا تو کوئی پکی ہوئی چیز نہیں کھاؤں گا..... صرف پھل“۔

اس روز مجھے خوف لا گو ہوا کہ شاید ..... شور بہہ، سبزیاں، خشناش، کچپری کھانے والا بہم میں نہیں رہے گا لیکن وہ اتنے اشماک سے لندن جانے کا پروگرام بناتے رہے کہ یہ ہلاکا ساخوف بھی جلد جاتا رہا۔

شاب بھائی کو پھل بہت پسند تھے۔ وہ چائے کی پیالی پینے سے پہلے خربوزہ، آم، سیب جو بھی موسم کا میرا ہوتا کھانا پسند کرتے ..... لیکن اگر پھل موجود نہ ہوتا تو وہ تقاضا کرتے نہ اس کے متعلق کوئی سوال کیا جاتا۔ ایک روز کہنے لگے ..... ”جب میں نے نیا نیا آئی سی ایس پاس کیا اور لندن گیا تو وہاں جا کر مجھے پہنچا کہ انگریز چائے پر پھل ضرور کھاتا ہے اس لئے میں نے پورا آئی سی ایس بننے کے لئے پھل کھانے کی عادت ڈال لی ہے.....“ -

غالباً یہ ایک پرده تھا..... جو وہ اپنے معمولات چھپانے کے لئے کیا کرتے۔ اللہ نے دنیاوی اور دینی فتویں کے دروازے ان پر کھول رکھے تھے اور وہ جانتے تھے کہ اللہ جس کو چاہے نوازے، جس کو چاہے راندہ در گاہ آ دے ..... سب کچھ توفیق سے ملتا ہے لیکن وہ اپنی عبدیت قائم رکھنے کے لئے بڑی کڑی مشقت کرتے ہماری ساری رات عبادات میں گزارنا ان کے لئے معمولی بات تھی۔ اسی لئے وہ پھل، ٹھنڈے مشروبات، خبستہ پانی، شکر بجیں، بڑے شوق سے پیتے تھے۔ ان کے سارے جسم میں اللہ کے نام کی بھڑکی گئی ہوئی تھی اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے وہ آہستہ چلتے، ٹھنڈی میٹھی گلگلو کرتے اور خن پانی پیتے۔

شاب بھائی ہر معاملے میں اعتدال کو پسند کرتے تھے ..... کھانے پینے میں سرکی وال کی کچپری، خشناش، سبزیاں، پھل شوق سے کھاتے۔ اس کے معنی نہیں کہ انہیں گوشت ناپسند تھا..... بلکہ یہاں سمجھتے کہ جو کچھ ان کے سامنے لا گا دیا وہی پسندیدہ ہو گیا۔ نمک زیادہ ہواتوہ بولے نہیں۔ کم ہواتوہ انہوں نے نہیں۔ میں نے انہیں نمک دانی سے چھڑک کر کسی سالن پر نمک ڈالتے ہوئے نہیں دیکھا۔ صرف ایک چینہ میں

اپنی پسند کا اصرار کیا کرتے تھے وہ بھی بہت لجاجت اور منت کے ساتھ کہتے ..... "محمد اپانی ..... "اگر بر ف کوٹ کو بھی گلاس میں دے دی جاتی تو وہ اسے خوشی سے پیتے ..... اور اگر پلانے والا نکلے کاپانی لے آتا تو وہ بھی آرام پلی جاتے ..... نہ کوئی شکایت کرتے نہ بر ف منگواتے۔ انہوں نے بھی بھڑکیے رنگ استعمال نہیں کئے۔ لیکن اب ار غونی مائل سرخ ڈرینگ گاؤن ایسا بھی ان کے پاس تھا جسے وہ بڑے اہتمام کے ساتھ پن کر ہم سب میں بیٹھا کرتے۔ شاب بھائی کی نوکری، زندگی اور نفاست پسندی کا تقاضا تھا کہ وہ خوش لباس رہتے۔ لیکن لباس کے متعلق انہوں نے بھی تلاش اور گفتگو نہیں کی۔

مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ اقبال سنیزیری کے سلسلے میں کچھ تقریبات لاہور میں ہو رہی تھیں۔ انہی تقریبات میں شرکت کے لئے مر جوم اسکندر باؤ سانی بھی روم سے پاکستان آئے ہوئے تھے اور انشا بھی موجود تھے۔ ان تقریبات پر صبح صحیتاری کا گرماگر مرحلاہ ہوتا۔ سب تیاری میں مصروف نظر آتے۔ شاب بھائی اپنے کپڑے پولے پولے ہاتھوں سے اٹھائے باہر آتے اور بڑی انگاری سے کہتے ..... " یہ ذرا کوٹ کے کار کو چھپلی طرف سے استری کرادیں تاکہ بہت زیادہ اکڑا ہوا محسوس نہ ہو ..... "۔

زیادہ کلف، جبی ہوئی اسٹری والے کپڑے، ہینگروں میں بیٹھے ہنگائے، درائی کلیز سے لوٹے ہوئے، کھڑکتے لفافے، خوبیوں کے بھجاؤ کے اڑاتے، ایسے کپڑے جن سے تیاری، خود آرائی، اور خود پسندی کا گماں ہو بھی ان کے ساتھ نہ ہوئے۔ وہ ایک انگریز صاحب کی طرح یہاں قیس لباس پہننے ان کے جو تے آرام دہ ہوتے ٹائیاں، جرایں، رومال، دستانے قیمتی اور لباس کے مطابق نظر آتے لیکن ان چیزوں سے کوئی طمطرانی ظاہر نہ ہوتی۔ کسی کو مر عوب کرنا، خود اپنی ذات کو نمایاں کرنا مقصود نہ ہوتا۔ دس بارہ سال پہلے انہوں نے شلوار قیصیں پہننا شروع کیا۔ رٹاڑ منٹ کے بعد صبح سیر کے بعد وہ کریب سول کے جو تے شرث اور پینٹ اتار دیتے اور سارا دون شلوار قیصیں میں ہی بس رکرتے۔ لیکن نہ تو قیس لباس وجہ عزت تھا۔ نہ شلوار قیصیں کی سادگی سے مراد قیصری کا اظہار تھا۔ شاب صاحب کی ذات کو کاغذ پر لانا اس لئے مشکل ہے کہ وہ کچھ بھی کسی کو دکھانے کی خاطر نہیں کرتے تھے۔ وہ محمل طور پر اپنے اندر اپنی نیت کے تابع تھے اور وہ اس کمپیس کو کسی صورت بھی غلط کرنے کو تیار نہ کھانے پینے کی طرح کچھ لباس، کچھ رنگ، کچھ شائل انسیں بھی پسند تھے لیکن ان کی تلاش میں ان کے اصرار میں ان کی زندگی نہیں گزر تھی۔ پسند کا کپڑا ہاتھ آگیا وہ پن لیا..... ورنہ جو میسر آیا وہی پسندیدہ ہو گیا تھی۔

رنگ کے باوجود عموماً وہ کہا کرتے ..... " اس بار میں اپنا Conduct درست کر کے آؤں گا۔"

سردیوں کا موسم تھا۔ شاب بھائی اپنا سرخی مائل سیرون ڈرینگ گاؤن پہنے بیٹھے تھے اور انہیں سردی الگ رہی تھی۔ اشیر خاں نے بھانپ کر کہا ..... "شاب چچا! میں اپنا سویٹر لادوں؟" -

"ہاں لادو ..... لیکن وہ تم ساری ایچ پر زیادہ سوت کرنے والا نہ ہو ..... "

اشیر خاں ایک بجھا بجھا ساہل کا نیلے رنگ کا سویٹر لے آئے۔ شاب بھائی نے اسے آرام سے پن لیا لیکن

سردی کم نہ ہوئی۔ ”جیکٹ لاوں جی؟.....“ اشیر خاں نے پوچھا۔  
”ہاں بھی سردی کچھ زیادہ ہے.....“

اشیر خاں ایک سواتی گرم جیکٹ لے آئے جس پر براون ریشمی دھامگے کے بیل بوٹے بنے تھے۔ چونکہ یہ واحد اکتوبر جیکٹ تین بھائیوں کے درمیان تھی اور شاب بھائی کو بھی علم قاصل لئے انہوں نے ہلکے سے تال کے بعد اسے بھی پن لیا۔ اور تیل بوٹوں پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

انتہے میں اپنی خاں بھی اپنی چادر لے کر آگے تو شاب بھائی نے وہ بھی اوڑھا۔ غالباً اگر کوئی اور غرض اور کوٹ، رضائی، کبل، دھوت، کھیس، جو کچھ بھی لاتا وہ قبول کرتے اور بغیر اعتراض کئے پن لیتے۔ دوسرے کامان بڑھانے کے لئے، اس کی اہمیت بنانے کے لئے چھوٹی چھوٹی فرمائیں کرتے۔ ورنہ نہ انہیں سویٹروں کی ضرورت تھی نہ چادروں کی۔ وہ اندر کی حدت سے گرم ہوتے اور اندر کا ایک کنٹری شرہی ان کی سردی کا باعث ہوتا۔

صح کاذب سے پلے کاسنی کمرے کے بند دروازے کی چلی جھری سے ایک چھوٹی سی روشنی کی لکیر جھا لتا کرتی۔ تجد کے وقت ان کے غسل غانے کی کھڑکی سے روشنی کا ایک طاق پتھر بغلی راستے کی دیوار پر پڑتا۔ لیکن نہ تو پانی کا شور سنائی دیتا نہ کسی اور قسم کی کھڑک پڑ سنائی دیتی۔ کچھ لوگ جب جاگ جاتے ہیں تو پھر انہیں دوسروں کی نیند سے منقصت پیدا ہو جاتی ہے رودا و نجی اونچی اللہ کا نام لیتے ہیں۔ شپٹر شپٹر چلتے ہیں۔ ان کے منہ باہم دھونے وضو کرنے سے پانی کے خوفناک چھپا کے سن کرنے کا جاگ اٹھتے ہیں۔ مائیں بے آرام ہو جاتی تھیں۔ لیکن شاب بھائی کی گھری کالارم بھی بھی کسی نے نہیں سنایا۔ مجھے ان کے ساتھ عمرہ کرنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ شاب بھائی، خاں صاحب اور میں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے اور شاب بھائی ہر رات تجد گزارنے خانہ کعبہ جاتے تھے۔ رات کو وہ چوری چوری الارم لگاتے۔ اور پہنچنے کی سیکھی پہنچنے کی سیکھی کے ساتھ کمرے کے بند کر دیتے کہ ہمیں سارے عمرے کے دوران ایک بار بھی جاگ نہیں آئی۔ وہ جانتے تھے کہ کمزور، دنیادار، اور طبعی طور پر سلماندی کے مارے ہوؤں کے لئے الارم کی تھنٹی تاویب کا باعث تونہ ہوگی البتہ شرمندگی کا موقع ضرور بہم پہنچائے گی۔ ہم سوئے رہتے اور وہ مجرکی نماز کے بعد تمہری موس میں چائے بھرو اکے ہمارے لئے لے کر آتے اور پھر ہمیں جاتے پا کر کتے۔

”آج..... حرم شریف کے سامنے یوں ہوا..... کہ ایک بد و.....“ -

شاب بھائی کو معلوم تھا شروں میں گھر پر رہنے والیاں ایک ہی ماہول میں رہنے کے باعث اوب جائی ہیں۔ ان کا رابطہ یہ وہی دنیا سے کم ہوتا ہے اسی لئے وہ گھر میں گھٹتے ہی مجھے، میری والدہ کو اور باقی جو بھی عورت گھر پر موجود ہوتی اسے اپنے تجربے میں شامل کر لیتے۔

شاب بھائی اور خان صاحب ناشتے کے بعد فترت چلے جاتے تھے وہ پس کا کھانا وہ بہت کم گھر نکھاتے۔

مریزی اردو بورڈ بعد میں اردو سائنس بورڈ ہو گیا، یہیں پر شاب بھائی دوپھر کے وقت خان صاحب کے ساتھ ملااد اور روٹی کھاتے اور بڑی تعریف کرتے۔

..... یار پاکستان میں یہ فتح راجح ہونا چاہئے ..... تھوڑا سا کچو مراد روٹی۔ لیکن اس میں ایک قباحت ہے ..... ”ضم بہت جلد ہو جاتا ہے .....“

عوما شاب بھائی اور خان صاحب عصر کی نماز سے کچھ پہلے گھر آتے۔ بڑے پھانک کو کھول کر جب وہ اندر اغل ہوتے تو بڑی دلچسپی سے گھر والوں کو اپنے گزارے ہوئے دن میں شامل کر لیتے ..... ”آج صبح اشفاق سے دوایے آدمی ملنے آئے جو Pain in the neck تھے اس کے لئے ..... لیکن میرا وقت اچھا گزرا ..... پھر میں نے غالذ زہری اور ہینڈی کو خط لکھا۔ دوپھر کو، ہم دونوں بیٹھن روز گئے اور ڈرائی فروٹ خریدا۔ لیکن اشفاق نے کابو او بادام زیادہ خود کھائے اور مجھے کم دیئے ..... موگ پھلی اس نے کم کھائی اور مجھے زیادہ کھلائی ..... ابھی آنے سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے ہم لارنس باغ گئے تھے وہاں ہم نے کیوں کھائے اور ایک ایسی عورت سے ملے جس نے اشفاق سے اپنے دوپئے پر آنگراف لیتے۔ مجھے اس نے پہچانیں ورنہ مجھے سے بھی ضرور آنگراف لیتی .....“

عصر کی نماز اور چائے سے بہت پہلے وہ بڑی خوش دلی، ہلکے ہلکے مزاج سے سارے دن کی کار گزاری، ملاقاتیں، وقت کی کچھ اس طرح بیان کرتے کہ کبھی بھی لیفٹ آؤٹ ہونے کا احساس پیدا نہ ہوتا۔ جس طرح ٹیلی ویژن پر کرکٹ کا مچی دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کرکٹ کے ہر کھلاڑی کے ساتھ ہیں ایسے ہی شاب بھائی دن بھر کی ڈائیری کچھ یوں بیان کرتے کہ لگتا ہم بھی ان دونوں کے ساتھ رہے ہیں حالانکہ صبح ہی سے ہمارا پتہ کٹ چکا ہوتا۔ وہ اصل شاب بھائی کے ساتھ بھی بھی کوئی لیفٹ آؤٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب کوئی ملا، بڑی خاموشی سے ان کے ساتھ ہو لیا۔ کمائی کا وسط ہو تو شاب بھائی پوری توجہ سے پچھلی بات بتاویتیتے ..... کھانے کا وسط ہو تو شاب بھائی اپنی کھانے کی فقریوں کم کرتے کہ آنے والے کے ساتھ ہی کھانا ختم ہوتا۔ پتہ نہیں وہ کون ساطریقہ تھا کہ شاب بھائی سب میں گھٹے ملے بھی رہتے تھے اور سب سے الگ تھاگل بھی قائم۔ غالباً ان کا مقولہ تھا کہ ”ہم پاس بھی سب کے رہے اور دور بھی سب سے۔“ بہت سارے سال عصر کے بعد ہلکی ہلکلی چائے پیتے ہی شاب بھائی اور خان صاحب باہر کسی نہ کسی سے ملنے چلتے جاتے تو اپسی پر کھانا کھاتے اور اس کے بعد شاب بھائی اپنے کاسنی کرے میں رہنا تھا جاتے ..... شام کی ملاقاتوں کا معمول بہت بعد میں شروع ہوا ..... شام گئے کی یہ ملاقاتیں غفت کی وجہ سے ہونے لگیں ”غفت بہت بیمار ہے اور آج لاہور آرہی ہے شاید وہ ہمارے ہاں قیام کرے تم اصرار نہ کرنا اس کی مرضی پر چھوڑ دیا .....“ خان صاحب نے مجھے صرف اتنا کہا اور ڈرائیور کے ساتھ ایسپورٹ روائی کر دیا۔

جب سواریوں میں غفت اتری تو میں جران رہ گئی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ماںک بہ فربی عورت تھی۔ لیکن خواتین سیڑھیوں کی ریٹنگ کا نہ سارا لے کر اتری اس کی ناک کا بانسہ بہت تیکھا اور اونچا، چہرہ ستا ہوا، جسم نبالغ لڑکی

